عالمی مشکلات کا حل

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

ایک ایسا شخص کہ جس نے اتنے ہی تنگ ماحول میں آنکھ کھولی ہو جتنے محدود دائرہ میں ایک مولوی کی تربیت ہوتی ہے اور جس کے معلومات بھی بہرحال اسی دائرہ کے اندر محدود ہیں۔ جسے کبھی اپنے ملک سے باہر کسی دوسری فضا میں سانس لینے کا بھی موقع نہ ملا ہو جس نے کبھی کسی سیاسی مبصر سے تبادلۂ خیال بھی نہ کیا ہو، یہاں تک کہ بلا استثنا کبھی کسی سیاسی پارٹی کی ابتدائی ممبری بھی اختیار نہ کی ہو۔ اس سے یہ توقعات ہی کیوں قائم کئے جائیں کہ وہ عالمی مشکلات کا کوئی سیاسی حل پیش کرے گا۔ جب کہ مجھے نہ تو متفکرین و مدبرین عالم کے نظریوں کا کوئی واضح علم ہے اور نہ میں نے سیاست سے متعلق سیاست دانوں کی کتابوں کا مطالعہ ہی کیا ہے تو ایسی صورت میں میں یہی نہیں سمجھ سکتا کہ عالمی مشکلات ہیں کیا؟ ان کا حل بتانا تو بعد کی بات ہے۔ درحقیقت میں جو کچھ کہوں گا وہ کوئی نئی بات نہ ہوگی۔ بلکہ وہی ۱۴ سو برس قبل کے سبق کا آموختہ آپ کے سامنے دوہرا دوں گا۔ خواہ اسے دنیا تنگ نظری سمجھے یا پرانی لکیر کا فقیر خیال کرے یا قدامت پسندی اور رجعت پسندی کا الزام لگائے۔

لیکن میرے خیال میں یہ عالم کوئی اور چیز نہیں ہے بلکہ درحقیقت مختلف نفوس کے مجموعہ کا نام ہے اور اس لئے عالمی مشکلات کا پتہ لگانے کے لئے کسی بیرونی جستجو کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اگر کوئی دوسرا نہ ہو تو ہم اپنی ذات کے نفسیات کا مطالعہ کر کے تمام عالم کے متعلق اندازہ کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے اسے پھر کوئی تنگ نظری خیال کرے اور کہے کہ یہ ویسا ہے جیسے گولر کا کیڑا دنیا کو بس گولر میں محدود سمجھتا ہے، میں اسے تسلیم کرتا ہوں لیکن مجھ میں اور اس میں تھوڑا فرق ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ دنیا کو گولر میں محدود سمجھتا ہے اور میں اپنے نفس کو عالم پر محیط سمجھتا ہوں۔ یعنی میں عالمِ اصغر میں عالمِ اکبر دیکھتا ہوں۔

درحقیقت افراد کا مجموعہ قوم ہے۔ اقوام کا مجموعہ ملک ہے اور ممالک کا مجموعہ عالم ہے۔ اب جو خرابیاں افراد میں ہوں گی وہ عالمی مشکلات کا سبب بنیں گی اور وہی چھوٹی برائیاں جو اشخاص میں ہوتی ہیں اور انفرادی سمجھ کر نظر انداز کردی جاتی ہیں۔ وہی اقوام میں پیدا ہونے سے عالمی مشکلات میں اضافہ کا سبب بنیں گی۔ لہٰذا اگر عالمی مشکلات کو دور کرنا ہے تو اس کی واحد صورت یہی ہے کہ شخصی کردار کی درستی کی جائے۔ میرے پیشِ نظر حکیم روحانی حضرت علیؑ ابن ابی طالب کے دو شعر ہیں:

دوائوک فیک ولا تبصر
وداؤک فیک ولا تشعر
اتزعم انک جرم صغیر
وفیک انطوی العالم الاکبر

(یعنی) تیرا علاج تجھی میں نہاں ہے مگر تو نہیں دیکھتا اور تیرا مرض تجھی میں پوشیدہ ہے مگر تو بے خبر ہے۔ تو اپنے کو محدود سمجھتا ہے حالانکہ تیرے نفس میں بہت بڑا عالم مضمر ہے۔

پھر میں نے تو عالمی مشکلات ہی کو موضوع قرار دیا ہے ۔قرآن نے تو رسولؐ کو رحمۃ للعالمین بنایا یعنی بین الاقوامی درجہ دیا اور خود رسولؐ نے اپنے مقصد بعثت کو ان الفاظ سے ظاہر کیا کہ **انمَا بعثت لاتمم مکارم الاخلاق**''میرا مقصدِ بعثت صرف نوعِ انسانی کو حسنِ اخلاق سکھانا ہے'' خدا نے آپ کو حصر کے ساتھ رحمۃ للعالمین کہا اور آپ نے حصر کے ساتھ یہ بتایا کہ میرا مقصدِ بعثت نوعِ انسانی کو اخلاق کی تعلیم دینا ہے ۔ دونوں کو ملانے سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ عالمی مشکلات کا حل صرف اسی میں ہے کہ نوعِ انسانی زیورِ اخلاق سے آراستہ ہوجائے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ عالمی مشکلات کا کیا سبب ہے ؟ حضرت علیؑ ابن طالبؑ فرماتے ہیں ۔''تمام ہنگاموں اور بے چینیوں کا سرچشمہ ہوتی ہیں نفسانیتیں جن کی تحریک سے قدم آگے بڑھایا جاتا ہے اور کچھ غلط نظریئے جن کو ایجاد کیا جاتا ہے جن میں قوانینِ الٰہیّہ کی مخالفت ہوتی ہے اور کچھ لوگ دوسروں کے ساتھ مل کر پارٹیوں کی تشکیل کر لیتے ہیں''۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

''سب سے بڑی خطرناک چیزیں جن کا اندیشہ کیا جاسکتا ہے دو ہیں ۔ایک نفسانیت کی پیروی اور دوسرے آرزوؤں کا بڑھانا۔نفسانیت کی پیروی وہ ہے جو حقانیت کو نظر انداز کراتی ہے اور آرزوؤں کا بڑھانا آخرت کے فراموش کرانے کا سبب ہے۔''

حقیقتِ امر یہی ہے کہ انسان ہوا و ہوس کا بندہ ہے۔ اس کی آرزوئیں لامحدود ہیں اور اشیاء ہیں محدود اب اگر سارا عالم ایک ہی انسان کو دے دیا جائے تو آخر باقی دوسرے لوگ بھی تو ہیں۔ان کے ضروریات ہیں اور خواہشات ضروریات تو ہر شخص کے پورے ہوسکتے ہیں البتہ خواہشات ہر شخص کے پورے نہیں کیئے جاسکتے۔

اکثر آپ نے بڑے بوڑھوں کو کہتے سنا ہوگا کہ سب حسرتیں پوری ہوگئیں۔بس ایک حسرت ہے اور وہ یہ کہ اپنے لختِ جگر کے سہرا بندھتے دیکھ لیں۔ جب یہ حسرت پوری ہوگئی تو پھر یہ حسرت ہوئی کہ اب اپنی آنکھوں سے پوتے کو کھیلتے دیکھ لیں۔ پھر اس کے بعد میں اس کے سہرے کی حسرت غرض کہ عمر ختم ہوجائے مگر ایک حسرت ختم نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح کسی کی تنخواہ ۵۰ روپیہ ہو اور اسے شکایت ہو کہ ۵۰ روپیہ کم ہیں، اگر ۱۰ روپیہ کا اضافہ ہوجائے تو سب ضروریات پورے ہوجائیں۔ دوسرے سال دس روپیہ کی ترقی ہوگئی اب پھر ۱۰ کی کمی محسوس ہونے لگی۔ یہاں تک کہ چاہے جتنی تنخواہ ہوجائے مگر دس ۱۰ روپیہ کی کمی ہمیشہ باقی رہے گی۔ یہ ہی آرزوؤں کی وسعت ہے جو سلاطین اور بڑی طاقتوں میں اقوام وممالک کی فتح کی صورت میں نظر آتی ہے۔

ایک ملک کی حکومت کہتی ہے کہ ہمارے ملک کی زمین ہمارے افراد کے لئے ناکافی ہے۔اگر ہمسایہ ملک کا تھوڑا سا حصّہ مل جائے تو ہمارے ملک کے آدمی آرام سے آباد ہوسکیں گے اسی لئے جنگ شروع ہوگئی ۔لیکن جنگ کے دوران میں جتنی زمین دستیاب ہوتی گئی اتنی ہی ہوس ملک گیری اور بڑھتی گئی اور جو کمی پہلے دن محسوس ہورہی تھی برابر محسوس ہوتی رہی۔ جس کا نتیجہ دائمی تصادم کی شکل میں آنکھوں کے سامنے آتا رہا۔

دوسری سب سے بڑی وجہ مشکلات کی ہے ۔

لامرکزیت! یعنی نوع انسانی کا کسی ایک مرکز پر متفق نہ ہونا اور اس لامرکزیت کا سبب ہے مادیت۔ جب مادیت کے زیر سایہ کوئی نظریہ فروغ پائے گا تو ہمیشہ نوع انسانی میں تفریق کا باعث بنے گا۔ کیوں کہ جب مادیت کے قائل ہوئے تو رشتے اپنی ذات کی نسبت سے قائم کئے جائیں گے اور یگانہ و بیگانہ کے امتیاز پیدا ہوں گے۔ اپنا ملک، غیر کا ملک، اپنی قوم، غیر قوم، اس کا نتیجہ ہے کہ جب کسی شئے پر غور کیا جائے گا تو اس نقطۂ نظر سے کہ اپنا فائدہ ہو، اپنے ملک کا فائدہ ہو اور اپنی قوم کا فائدہ ہو۔ اس کا لازمی نتیجہ ہے تصادم اور عالمی مشکلات اب یا تو ایسے حل کی طرف نظر ہی نہ کی جائے جو ہر ملک و قوم کے لئے قابل قبول ہو۔ یا پھر ایک ایسا مرکز ماننا پڑے گا جو نہ مشرقی ہو نہ مغربی ہو، نہ کسی ملک سے اس کا زیادہ تعلق ہو نہ کسی سے کم، نہ کسی قوم سے اس کا لگاؤ ہو نہ کسی جہت سے، بلکہ مشرق و مغرب، قوم و ملک اور زبان و مکان سب پر محیط ہو اور جس کی ذات مادیت سے بالکل منزہ اور پاک ہو ورنہ دوسرا کوئی مادی مرکز قائم ہو ہی نہیں سکتا۔

آج نوع انسانی جس رخ پر جارہی ہے وہ رخ ہی غلط ہے لہٰذا کبھی وہ منزل تک پہنچ نہیں سکتی۔ آج کل ترقی علم و تمدن کا زمانہ ہے۔ تعلیمی ادارے قائم ہیں جن میں ڈاکٹر، طبیب، انجینیر، وغیرہ سب کچھ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے یا اگر مشرقی تعلیم گاہ ہے تو پیش نماز مولوی، مجتہد، غرض کہ سب کچھ بنانے کی کوشش ہوتی ہے۔ لیکن کوئی ایک ادارہ بھی پردۂ دنیا پر اس وقت ایسا موجود نہیں ہے جس میں آدمیوں کو انسان بنانے کی کوشش کی جاتی ہو۔ ایک مرتبہ ہماری لکھنؤ یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے جلسہ میں ایک لڑکے کو حسنِ اخلاق کا تمغہ دیا گیا تو ایک معلم کی زبان سے Shame Shame ''شرم شرم'' کے الفاظ نکلے۔ جب ان سے دریافت کیا گیا کہ اس سے ان کا مقصد کیا ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ ''حسنِ اخلاق کی سند لڑکیوں کے شایانِ شان ہے۔'' ''لڑکوں کو اس کی کیا ضرورت ہے''۔ اگر انسانوں کا یہی مطمحِ نظر ہو جائے تو پھر انسانیت کا خدا حافظ ہے، اس مطمحِ نظر کے پیشِ نظر انسان جتنی ترقی کرے گا وہ حیوانیت ہی کی ترقی ہوگی۔ انسانیت کی ترقی کبھی نہ ہوگی بلکہ اس طرف قدم بڑھا کر وہ حیوان سے بدتر ثابت ہوگا۔ یعنی ہمارا اسلامی عقیدہ تو یہ ہے کہ انسان پڑھا پڑھایا دنیا میں آیا۔ لیکن مادیین کہتے ہیں کہ وہ پہلے جانور تھا اس مفروضہ کے پیش نظر میں کہتا ہوں کہ کاش وہ اسی طرح جانور ہی رہتا۔ کیوں کہ اس وقت میں تو وہ صرف اپنے دانتوں اور ناخنوں سے جو قدرت نے اسے دیئے تھے غصہ کے وقت کام لے سکتا تھا۔ لیکن جتنی ترقی ہوتی گئی اتنے ہی اس کے لئے امن و امان کے امکانات ختم ہوتے گئے۔ ناخنوں اور دانتوں سے بالکل قریب کے انسان کو نقصان پہنچایا جا سکتا تھا۔ لہٰذا پہلے پتھر مارنے کی ابتدا ہوئی۔ پھر گوپھن اور تیر سے کام لیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ بندوقیں بنیں۔ لیکن اب بھی تباہ کاریاں حسب دلخواہ ممکن نہ تھیں۔ لہٰذا ایٹم بم بنایا گیا جس سے پھینکے جانے والے رقبہ میں کسی ذی حیات کی زندگی باقی نہیں رہ سکتی کون کہہ سکتا ہے کہ ذرات میں یہ قوت پہلے نہ تھی۔ اب پیدا ہوگئی قوت ہمیشہ سے تھی اور بخدا یہ قوت تعمیر میں صرف ہورہی تھی لیکن جس دن سے انسان کو اس کا علم ہوگیا۔ اسی دن سے تخریب میں صرف ہونے لگی۔

دیکھئے مادّیت اور روحانیت کے راستوں میں کیا فرق ہے۔ مذاہب کے آپس کے اختلافات سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف روحانیت کے مقصد کو لے لیجئے جو تمام مذاہب

کے نزدیک متفق علیہ ہے اور یہ دیکھئے کہ اس جادہ پر گامزن ہونے والوں نے اگر انتہا پسندی سے بھی کام لیا تو اس طرح کہ موذی جانوروں تک کو مارنا گناہ قرار دے دیا اور مادیت کے راستے پر چلنے والوں نے نے جو رخ اختیار کیا تو یہ بے گناہ اور گناہ گار کسی میں کوئی امتیاز تک باقی نہ رہا۔ یہاں تک کہ جاپان میں جس مقام پر ایٹم بم پھینکا گیا تھا وہاں جانور اور نباتات زندہ نہ بچ سکے۔ اس سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ روحانیت نوع انسانی کو کس رخ پر لے جاتی ہے اور مادیت کس طرف کوئی بتائے کہ کس میں قیامِ امنِ عالم کی صلاحیت ہے اور کس میں نہیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کی اکثریت ہمیشہ مادہ پرست لوگوں کی رہی۔ اس کا ثبوت ان کہاوتوں سے ملتا ہے جو مشہور ہوجاتی ہیں۔ کہاوت کے معنی میں مضمر ہے یہ امر کہ عام لوگوں کی زبانوں پر چڑھ جائیں اور انھیں سے عام رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ میں اس وقت کچھ نظریئے پیش کرتا ہوں جو مذہب نے دنیا کے سامنے رکھے اور ان کے بالمقابل وہ نظریئے جنھیں ''مادّیت'' کی پیداوار کہا جاسکتا ہے۔ مگر یہ مادّی نظریئے مثل اور کہاوت بن گئے اور مذہبی نظریئے کتابوں کا جزو رہے۔ اسی سے نوعِ انسانی کا عام رجحان ظاہر ہے مگر ایک غور کرنے والا دونوں کے موازنہ سے یہ تو اندازہ کرہی سکتا ہے کہ امنِ عالم اور عالمی مشکلات کو حل کرنے کی روح کس میں مضمر ہے۔

مذہب نے تعریف کے محل پر کہا **"یؤثرون علی انفسهم ولو کان بهم خصاصة"** اپنے نفس پر غیر کو ترجیح دیتے ہیں باوجودیکہ خود ضرورت مند ہیں۔

مادّیت کی صدا بلند ہوئی کہ ''پہلے چراغ گھر میں جلایا جاتا ہے پھر مسجد میں'' یہ مثل بن گئی۔

مذہب نے قصاص کا حکم دیتے ہوئے کہا **''النفس بالنفس والعین بالعین والانف بالانف والاذن بالاذن والسن بالسن والجروح قصاص فمن تصدق فهو کفارة له''** یعنی بدلا بس اتنا لینا چاہئے کہ جتنا جرم ہو اور اگر معاف کردو تو بہتر ہے''۔

لیکن مادیت کی آواز نکلی'' کلوخ انداز را پاداش سنگ است'' یہ ضرب المثل ہوگئی۔

مذہب نے کہا **''لا قصاص قبل الجناية''** خطا کے قبل سزا کا کوئی استحقاق نہیں''۔

مادّیت نے کہا **''قتل الموذی قبل الایذاء''**

''ایذا رسانی کے پہلے موذی کو قتل کرنا چاہئے۔''

یہ کہاوت ہوگئی۔

مذہب نے کہا **''لاتزر وازرة وزر اخری''**

بے گناہ کو دوسرے کے گناہ کی پاداش نہیں مل سکتی''۔

مادیت نے کہا ''افعی راکشتن وبچہ اش را نگاہ داشتن کار خردمنداں نیست''۔

دیکھ لیجئے کہ موجودہ ترقی کے دور میں بھی عمل اسی دوسرے نظریہ پر ہو رہا ہے یا نہیں اور بخیالِ خود ''مجرم قوم'' کے شیرخوار بچوں تک پر کیا رحم کھایا جارہا ہے؟

عرب میں ایک ضرب المثل اسی مادی ذہنیت کی مشہور تھی کہ **''انصر اخاک کان ظالماً او مظلوما''** اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ مظلوم ہو یا ظالم''۔ ایک شخص نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے ذکر کیا آپ نے فرمایا میں بھی یہی کہتا ہوں۔ وہ بھی شخص متعجب ہوا۔ آپ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ میرا مقصد اس سے یہ ہے کہ جب مظلوم ہو تو مدد کرو اس سے ظلم کو دفع کرکے اور جب ظالم ہو تو اس کے ہاتھ کو ظلم سے روک کر اس کی

مدد کرو۔ اس لئے کہ اس کی حقیقی مدد یہی ہے۔

یہ ہے روحانیت کی تعلیم جس سے نوعِ انسانی کی اکثریت ہمیشہ منحرف رہی۔

مذہب پر بڑا الزام ہے کہ مذہب خوں ریزی کا باعث ہے لیکن اگر تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ مذہب کے نام پر جتنی خوں ریزی دنیا میں ہوئی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ خوں ریزیوں اور تباہ کاریوں کی ذمہ داری موجودہ ترقی اور تمدّن پر ہے۔ مذہب پر خونریزی کا الزام بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ مذہب ہی جنگ وجدال کا سبب تھا تو ممالک مغربیہ میں جہاں مذہب کی گرفت ڈھیلی ہوچکی ہے۔ جنگ کے امکانات کو ختم ہوجانا چاہئے لیکن ابھی جو عظیم جنگیں ہوئیں ان میں اتنی خوں ریزی ہوئی ہے جتنی مجموعی عمر عالم میں کبھی مذہب کے نام پر نہ ہوئی ہوگی۔ معلوم ہوا کہ یہ انسان کا ذوق صف آرائی ہے جو کبھی مذہب کے نام سے اور کبھی کسی اور نام سے پورا ہوتا رہتا ہے۔ مذہب پر الزام غلط ہے۔

حقیقت میں جس چیز کی دنیا میں قدر و قیمت ہوتی ہے اسی کا ملمع بنایا جاتا ہے۔ اسی لئے سونے کا ملمع بنتا ہے اور لوہے کا نہیں بنتا۔ اب اگر کوئی سونے کا ملمع کر کے پیتل دے دے تو اس میں سونے کا قصور؟ اگر قصور ہے تو اس کا جس نے ملمع کیا یا پھر آپ کی نگاہِ نقاد کا قصور کہ اصل و نقل میں تمیز نہ کرسکی۔ اگر سراب کسی پیاسے کو تکلیف پہنچانے کا باعث بن جائے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ پانی کو نایاب کردیا جائے میں تو کہتا ہوں کہ ہمیشہ جھوٹ کو سچ کا لباس پہنایا جاتا ہے۔ کیونکہ جھوٹ اس وقت تک جھوٹ ہی نہیں ہے جب تک سچائی کی شکل نہ اختیار کرے تو کیا اس سے سچ کی برائی ثابت ہوتی ہے۔ بس اسی طرح یہ سمجھ لیجئے کہ مذہب کی قدر و قیمت عوام کی نگاہ میں زیادہ ہوتی ہے تو مذہب کے نام پر بہت سے لوگوں کو دھوکہ دیا جاتا اور جنگ پر آمادہ کیا جاتا ہے اور جب مذہب کی قیمت کم ہوتی ہے تو پھر سیاسی نظریات مثلاً فسطانیت اور نازیت وغیرہ کے نام پر صف آرائی ہوتی ہے جیسا کہ یورپ میں ہوا۔

ہندوستان میں بدقسمتی سے حال کے واقعات نے بظاہر اس الزام کو کچھ تقویت پہنچادی ہے لیکن اصل یہ ہے کہ ابھی تک ہندستان میں چونکہ مذہب کی قدر و قیمت کسی حد تک باقی ہے اور مغرب کی طرح لامذہبیت پورے طور پر حاوی نہیں ہوسکی ہے۔ لہٰذا یہاں کے سیاست دانوں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ عوام کو سیاسی پارٹیوں سے کوئی دلچسپی نہ پیدا ہوسکے گی ، مذہب کو اپنا آلہ کار بنایا اور اس طرح عوام کو اپنا ہم آواز بنانے میں کامیاب ہوگئے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مذہب کے نام پر مرنے مارنے والے اسی کو گولی سے اڑادینے کے لئے تیار ہوگئے۔ جو ان کی جماعت کا سب سے بڑا مذہبی انسان تھا۔

میں تو کہتا ہوں کہ ایسے دعویداران مذہب کا نصب العین مذہب نہیں مادیت ہے جس طرح مادہ پرست اپنی ذات سے محبت رکھنے کی بنا پر اپنی ذات سے رشتے قائم کرتے ہیں اور جس طرح وہ اپنے ملک کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ اپنا ہے اپنی قوم سے اس لئے محبت کرتے ہیں کہ وہ اپنی ہے اسی طرح انھیں اپنے مذہب سے صرف اس لئے محبت ہے کہ وہ ان کا مذہب ہے نہ اس لئے نہیں کہ وہ حق ہے، لہٰذا وہ مذہب کب ہوا ایک طرح کی سیاست ہوگئی۔ تو پھر ایسے لوگوں کے طرزِ عمل کی ذمہ داری مذہب پر کب عائد کی جاسکتی ہے۔

بیشک مذہب انسان کے کردار پر پابندیاں عائد کرتا ہے جو اس کی مادی ذہنیت اور طبیعت کے رجحانات کے خلاف

ہیں اس لئے وہ چیخ اٹھتا ہے یہ کہہ کر یہ پابندیاں انسان کے حق آزادی کے خلاف ہیں مگر اصل میں اسے آزادی کا صحیح مفہوم ہی معلوم نہیں ہے۔

آزادی کے معنی ہر قید و بند سے رہا ہونے کے تو ہیں ہی نہیں ورنہ پھر قید ہستی سے رہا ہونا بھی ضروری ہوگا۔ یہ شاعری نہیں ہے بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ وجود اپنی بقاء کے لئے پابندیوں کا طلب گار ہے اب جس طرح جسمانی تقاضوں کا پورا کرنا بقائے جسم کے لئے ضروری ہے اسی طرح انسانیت کے تقاضوں کا پورا کرنا بقائے انسانیت کے لئے اور انہی تقاضوں کے پورا کرنے کا نام مذہب ہے۔

پھر اگر تنہا ایک انسان ہوتا تو اس کا بھی امکان تھا کہ کہہ دیا جائے کہ جو جی چاہے کرے لیکن جب دنیا میں اور بھی بہت سے انسان ہیں تو آزادی بس اسی حد تک ممکن ہے جہاں تک دوسروں کی حق تلفی نہ ہو اور جہاں سے دوسروں کو نقصان پہنچے وہاں سے پابندی ناگزیر ہے۔ یہ ایک انفرادی حیثیت سے پابندی ہے لیکن وہ نوع کو حق آزادی سے بہرہ یاب کرنے کا ذریعہ ہے اس لئے تمام نوع یا قوم کی آزادی کی بقا کے لئے ضروری ہے۔

آزادی کا یہ مفہوم کب ہے کہ جو دل چاہے وہ کرسکیں۔ میں کہتا ہوں۔ ایک بچہ جب انگارہ ہاتھ میں اٹھانا چاہتا ہے تو آپ اسے کیوں روکتے ہیں۔ کیوں آپ اس کو حق آزادی سے محروم کردیتے ہیں؟ اس وقت تو بالکل فطری تقاضے کے ماتحت اس کا ہر فعل ہوتا ہے۔ یا جب کسی شخص کا دماغ خراب ہوجاتا ہے تو آپ اس کی آزادی سلب کرلیتے ہیں۔ اس لئے نا کہ آپ کہتے ہیں کہ بچہ نادان ہے اس میں سمجھ نہیں۔ پاگل انسان حق و باطل میں تمیز نہیں کرسکتا۔ پھر جس طرح وہ آپ کے مقابلہ میں نادان یا بے عقل ہے اور اس لئے آپ کو اس پر پابندیاں عائد کرنے کا حق ہے اسی طرح آپ کی اکثریت اگر عقل کامل کے مقابلہ میں نادان و بے عقل ہے تو اسے آپ پر پابندیاں لگانے کا کیوں حق نہیں ہے اور مذہب تو انہی پابندیوں کا نام ہے جو ایک عقل کامل بلکہ خالقِ عقل کی طرف سے عائد ہوتی ہیں۔

نوع انسانی کی آزادی کے لئے جتنے طریقے دنیا والوں نے سوچے ان میں جمہوریت سب سے زیادہ مقبول طریقہ ہے۔ غور کیجئے تو جمہوریت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ کسی ملک کے بسنے والوں میں سے اکثریت جو چاہے قانون پاس کردے۔ یا جو طریقہ کار تجویز کرے وہی سب کے لئے نافذ ہو۔ مگر جمہور جو نام ہے عوام کا اس کی زندگی میں ایسا دور بھی آجاتا ہے اور آپ کی آنکھوں کے سامنے آپ کے ملک میں آیا کہ جب ملک کے کسی ایک یا چند صائب الرائے افراد نے کہہ دیا کہ اسوقت ملک کے آدمی پاگل ہوگئے ہیں۔ اب اگر اکثریت جو کچھ کہے وہی صحیح ہے تو اس وقت تو اکثریت پاگلوں کی ہے۔ اگر انہوں نے اپنے اقتدار اور اثر سے کام لے کر جو ان کے جذبات کے مطابق ہو وہ طے کردیا تو کیا وہ درست ہوگا اور کیا اس پر عمل نوع انسانی کے لئے کسی بہتری کا باعث ہوسکتا ہے۔ حقیقت میں ایسے عام پاگل پن کے وقت سیلاب کی روا اور ہوا کے رخ سے ایک یا چند افراد کا الگ رہنا ہی ان کی بلندی کا ثبوت ہے۔ پھر کیا ان بلند افراد کا یہ فرض نہ ہوگا کہ وہ اس اکثریت کو جو اپنے پاگل پن کی بدولت تباہی کے گڈھے میں جاری ہے۔ بچانے کی کوشش کریں۔ چاہے اس کی وجہ سے وہ سب پاگل ان کی جان کے دشمن ہوجائیں۔ مصلحین عالم کو جو اپنے وقت کے آدمیوں کے ہاتھوں ہر طرح کی اذیتیں اور مصیبتیں اٹھانا پڑیں ان کا فلسفہ یہی ہے۔ لیکن اگر

جمہوریت کو پیش نظر رکھا گیا تو وہ لیڈر یا حکمراں جو عوام کے مطالبہ کو غلط سمجھ رہا ہے اسے بھی کچھ نہ کچھ ان کا ساتھ دینا ہی پڑے گا۔ بقول میرے ایک دوست کے جمہور کا مطالبہ یہ ہے کہ دو اور دو کا مجموعہ چھ مانا جائے۔ یہ بیچارہ لیڈر جس نے ان پر حکومت حاصل کر لی ہے جانتا ہے کہ دو اور دو کا مجموعہ چار ہوتا ہے لیکن اگر وہ صاف صاف کہہ دے کہ چار ہے تو سب مخالف ہو جائیں اور آئندہ اس کو ووٹ نہ دیں گے اس لئے مجبوراً وہ کچھ ان کے مطالبہ کے قریب آ کر کہہ دیتا ہے مجموعہ پانچ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ خود اس کا ضمیر مطمئن اور نہ قوم اس سے خوش۔ یہ نتیجہ ہے اس کا کہ اقتدار عوام کے ہاتھ میں ہے لہٰذا بلند افراد بھی کھل کر حق بات نہیں کہہ سکتے۔ اب اگر کسی موقع پر انھوں نے اپنے ضمیر کی تحریک سے فطری طور پر دو اور دو چار کہہ دیا تو عوام میں ہنگامہ ہوا اور ان سے باز پرس ہوئی کہ آپ نے کیا غضب کیا تو پھر اس وقت وہ اس کی تاویل کرتے ہیں کہ نہیں میرا مقصد یہ نہیں تھا یہ تھا کہ دو اور دو ساڑھے چار ہوئے۔

حقیقت میں طاقت اور قانون اکثریت کے ہاتھ میں ہونا ہرگز تمام انسانوں کی آزادی نہیں ہوگی۔ یہ صرف طاقتوروں کی آزادی ہوگی، صاحبانِ قہر و غلبہ کی آزادی ہوگی۔ کمزور اب بھی غلام رہیں گے۔ اقلیتیں اب بھی بے بس رہیں گی۔ تمام انسانوں کی آزادی تو اسی وقت ممکن ہے جب قانون بنانے والا کسی انسانی جماعت میں شامل نہ ہو اور تمام انسان نفسیاتی طور پر مطمئن بھی اسی وقت ہو سکتے ہیں جب ایک بالا دست طاقت کی طرف سے قوانین کا نفاذ ہو۔ کیونکہ تمام انسانوں کی آزادی کا انحصار ہے عدل عام پر اور عدل عام کا قرار بغیر ایک غیر مادی نقطۂ وحدت کو مانے ہوئے ممکن ہی نہیں ہے۔

''عدل عام'' کی مثال دائرہ کی ہے۔ سوائے دائرے کے کوئی شکل ایسی نہیں جس میں خطوط کھینچے ہوئے سب برابر ہوں اور دائرہ کی تشکیل اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک مرکز نہ مانا جائے۔ مرکز وہ وسطی نقطہ ہوتا ہے۔ جس سے محیط تک کھینچے ہوئے تمام خطوط برابر ہوا کرتے ہیں۔ یہ مرکز غیر مرکب ہوتا ہے۔ آنکھوں سے نہیں دکھائی دے سکتا اور عدل عام بغیر ایک مرکز واحد کے تصور کے ناممکن ہے جسے تمام نوع انسانی کے ساتھ برابر سے تعلق ہو۔ پھر اگر ایک دائرہ کے مرکز کو اگرچہ آنکھ سے نہیں دیکھتے مگر ماننا ضروری ہوتا ہے تو کائنات کے واحد مرکز کو آنکھ سے دیکھنے کی کیا ضرورت ہے جو آنکھ سے دکھائی دے گا وہ محدود ہوگا۔ پھر مرکز ہونے کی صلاحیت نہ رکھے گا۔ وہ غیر منقسم، غیر مرکب اور غیر محدود ذات غیر مرئی ہوگی جو سب کا واحد مرکز قرار پا سکے گی لیکن اسی مرکز کے تصور سے اس عدلِ عام کا قیام ہوگا۔ جس پر دنیا میں نظام امن کے قیام کا انحصار ہے اور جب کبھی حکومت قائم ہوئی اس مرکزی ذات کی طرف نسبت رکھتی ہوئی تو اس میں بے امنی اور بے چینی کا وجود نہ رہا۔

یاد رکھنا چاہئے کہ ہم مذہب کی حکومت کے معنی کسی مذہب کی طرف نسبت رکھنے والوں یا ظاہری طور پر ماننے والوں کی حکومت نہیں سمجھتے بلکہ درحقیقت مذہب کی حکومت اس مذہب کے تعلیمات کی حکومت یا اس ذات کی حکومت ہے جس کے افعال مذہبی طور پر سند ہوں یعنی جسے غلطیوں سے بری سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کی مثال عیسائیوں کے پاس کوئی نہیں ہے اس لئے کہ حضرت عیسیٰ کو حکومت کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ لیکن مسلمانوں کے پاس متفقہ حیثیت سے اس کی مثال ہے اس دور میں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کے نظم و نسق کے ذمہ دار تھے اور ہندوستان

میں یہاں کے مذہبی عقائد کے مطابق ایک زمانہ میں ایسی حکومت قائم تھی جبکہ تمام رعایا مطمئن اور خوشحال تھی جسے رام راج کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کو روحانیت کی حکومت کا جب بھی تجربہ ہوا ہے اس میں امن وامان نظر آتا رہا ہے اور مادیت کی حکومتوں کے تجربے دنیا کی آنکھوں کے سامنے ہیں جن کے مشکلات کا ہر ایک کو احساس ہے اور اسی کی بنا پر عالمی مشکلات کے حل کی تلاش ہے۔ روحانی سیاست اور مادی سیاست میں کیا فرق ہے اسے ایک مثال سے سمجھ لیجئے کہ جب مادیت فتح پاتی ہے تو اس دور ترقی میں بھی وہی کرتی ہے جو جنگ عظیم کی کامیابی کے بعد فتحیاب طاقتوں نے جرمنی کے زمانۂ جنگ کے لیڈروں کے ساتھ یا جاپان میں ابھی ابھی وہاں کے زمانۂ جنگ کے وزیر اعظم اور اس کے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ کیا لیکن مذہبی حکومت جب دشمن پر فتح پاتی ہے اسے جا کر دیکھے مکّہ معظّمہ میں اس موقع پر جب پیغمبرؐ اسلام کا فاتحانہ داخلہ ہوا ہے۔ اس موقع پر ایک انگریز مورّخ نے لکھا ہے کہ عام توقع تو یہی ہوسکتی ہے کہ اس موقع پر تڑپتی ہوئی لاشیں نظر آئیں گی اور درو دیوار مکہ خون سے رنگین نظر آرہے ہوں گے۔ مگر کیا ہے کہ زمین پر ایک خون کا دھبہ نہیں ہے کسی زخمی کے کراہ کی آواز بھی نہیں۔ یہ ہے محمد مصطفیؐ کا رحم وکرم جس نے تمام اہل مکّہ کو امن دے دیا ہے اور ان کے تمام لیڈروں کو بغیر سزا دیئے ہوئے چھوڑ دیا۔

جب وہاں کے بڑے بڑے لوگ حضرت کے سامنے آئے تو آپ نے ان سے پوچھا کہ بتاؤ تمہارا میرے متعلق کیا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا۔ یاد رہے یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے تیرہ سال تک آن حضرتؐ پر ہر قسم کے مظالم روا رکھے تھے لیکن اس کے ساتھ وہ رسولؐ کے بلند اوصاف و خصائل سے بھی بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ما نظن الا خیرا اخ کریم وابن اخ کریم۔ ہم تو آپ سے خیر ہی خیر کی توقع رکھتے ہیں آنحضرتؐ نے فرمایا اچھا جاؤ تم کو معاف کیا۔ اس کے بعد ان کے سردار کو ابوسفیان کے ساتھ جو تمام مخالفتوں کا ذمہ دار تھا۔ یہ خاص امتیازی سلوک کیا گیا کہ فرمایا:

من دخل دار ابی سفیان فھو أمن۔

جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوجائے اسے خاص طور پر امن ہے، موجودہ تمدن اور روشن خیالی کے دور میں سلطنتوں نے فتح پانے کے بعد جو مثال قائم کی ہے وہ تو بڑی خطرناک ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ اصول ایک ہوتا ہے۔ اب تک یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر حکومت کے عہدہ داروں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی سلطنت کے فرائض وفاداری کے ساتھ انجام دیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت وہ جو کچھ بھی کر رہے تھے وہ ایک فرض کا ادا کرنا تھا۔ اب اگر فتح ہونے کے بعد آپ نے ان کو اپنی عدالت میں لے کر اس وقت کے ان کے افعال کی سزا دی تو اس کے معنی ہیں یہ اصول قائم کرنا کہ کسی حکومت کے عہدہ داروں کو کسی جنگ کے وقت اپنی حکومت کے فرائض کی تکمیل کے ساتھ اس کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ اگر کہیں فریق مخالف کو غلبہ ہوگیا تو کیا ہوگا؟ یعنی اپنی حکومت کے فرائض کو تندہی سے انجام نہ دینا چاہئے۔ بلکہ فریق مخالف کی رضاجوئی کی بھی فکر رکھنا چاہئے پھر آپ کو اپنے عہدہ داروں سے یہ توقع رکھنا کب درست ہوگا۔ کہ وہ کسی جنگ کے موقع پر آپ کے فرائض تندہی سے انجام دیں گے۔ جب کہ ''جنگ دوسر دارو'' کے مصداق یہ اندیشہ ہمیشہ ہے کہ کہیں فریقِ مخالف کو غلبہ نہ ہوجائے اور اس

وقت ہم کو اس وقت کی وفاداری کی پاداش نہ ملے۔حقیقت میں بڑی ذمہ داری کسی فرد یا جماعت پر اسی وقت عائد ہوتی ہے ۔جب اسے غلبہ اور اقتدار حاصل ہوجائے اس وقت رعایا کے بارے میں عدلِ عام سے کام لینا حکمراں کے لئے انتہائی ضروری اور اہم چیز ہے۔اس بارے میں مذہب کی کیا تعلیم ہے ۔وہ آپ کو اس فرمان میں ملے گی جو حضرت علیؑ نے مالک اشتر کو لکھ کر دیا تھا۔جب انہیں مصر کا حاکم بنا کر بھیجا تھا اور جس میں انہیں اصول حکومت تعلیم فرمائے تھے آپ نے لکھا تھا کہ ''اے مالک تمہیں ایسی جگہ بھیج رہا ہوں جہاں ہر مذہب اور ملت کے لوگ موجود ہیں۔تم ان سب کے ساتھ ایسا برتاؤ رکھنا جیسا کہ ایک شفیق باپ کا ہوتا ہے۔اس لئے کہ ان میں کچھ تمہارے دینی بھائی ہیں اور کچھ خلقتِ انسانی میں تمہارے ساتھ شریک ہیں۔'' دنیا میں اس وقت تمام ممالک مشکلات کے حل کے لئے کانفرنسیں کرتے ہیں لیکن جب کہ ہر ملک کے نمائندے کے پیشِ نظر صرف اپنے ملک کا مفاد ہو تو ان کانفرنسوں سے مشترک حل پیدا ہی کیوں کر ہوسکتا ہے جب تک مشترک مفاد کو پیشِ نظر رکھ کر سوچا نہ جائے۔اور جب زبان پر ہے مشترک مفاد لیکن ہر ایک کے سامنے ہے اپنا مفاد تو حقیقتاً تمام ممبروں کی پوری سیاسی قابلیتیں اس پر صرف ہوتی ہیں۔کہ دوسروں کو بے وقوف بنا کر اپنے مفاد کی تجویز کو دوسروں سے بھی منوالینا ہے۔ کون اپنے اغراض نفسانیہ پر زیادہ بہتر ملمع کر کے دوسروں کو خیر خواہی کا یقین دلاسکتا ہے۔اس کے نتیجہ میں کبھی بے چینی دور نہیں ہوسکتی۔یعنی اگر وقتی طور پر کوئی تجویز پاس ہو بھی گئی تو جب امتداد زمانہ اور تجربات سے ملمع اڑے گا اور یہ ظاہر ہوگا کہ اس میں بعض کا فائدہ ہے اور بعض کا نہیں تو پھر تصادم ہونا ضروری ہے۔لہٰذا یا تو امنِ عالم کے قیام کے لئے ممالک میں کوئی ایسا سمجھوتہ ہوجائے کہ مشترک مفاد کا تصوّر ہی چھوڑ دیا جائے بلکہ اس اصول پر سمجھوتہ کرلیا جائے جو قرآن میں منکروں کے سامنے پیش کیا گیا تھا کہ ''ان سے کہو کہ اے میرے پیغام کو نہ ماننے والو میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو اور تم اس ذات کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں پرستش کرنے والا ہوں اور نہ یہ آئندہ کبھی ہونے کا ہے کہ میں اس کی عبادت کروں جس کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ بظاہر اسباب اس کی توقع ہے کہ تم عبادت کرو اس کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں تو پھر آپس میں تصادم اور کشمکش سے کیا فائدہ، تمہارے لئے تمہارا دین رہے میرے لئے میرا دین۔'' اسی اصول پر ممالکِ عالم سمجھوتہ کرلیں۔یعنی ہر ملک علٰحدہ اپنے مفاد اور نظریہ کو دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش چھوڑ دے بلکہ موسیٰ بہ دین خود عیسیٰ بدین خود'' کے مصداق ہر ایک اپنے پروگرام کو اپنے ملک میں محدود کردے مثلاً روس اشتراکیت کو اختیار کرچکا ہے تو وہ اس اشتراکیت کو اپنے یہاں محدود رکھے۔جو ملک جمہوریت پسند کرتا ہے۔وہ جمہوریت کو اپنے یہاں رائج رکھے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اپنے اثرات کو پھیلانے اور دوسروں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش ایک قلم ترک کردی جائے۔اگر ایسا ہو تو پھر ایک طرح کا امن قائم ہوسکتا ہے مگر اس کے لئے ایک تو ممالک کی ذاتی ہوس اجازت نہیں دے سکتی اور دوسرے موجودہ زمانہ میں ممالک کے درمیان سلسلۂ مواصلات کی زیادتی اور تجارت وغیرہ کے سلسلہ میں باہمی معاملات کی فراوانی نے یہ صورت دشوار بنادی ہے کہ ہر ملک دوسرے سے الگ تھلگ رہے اور اپنے نظام کا ہر ایک پابند رہے تو پھر نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مشترکہ مفاد کو پیشِ نظر رکھنا اور اس کے تحت میں سوچنا ضروری ہے لیکن مادی نقطۂ نظر سے جتنے حل تجویز کئے گئے وہ سب ناکام ثابت

ہوئے اور مادی سیاست نے اتنی ٹھوکریں کھائیں کہ اب اسے اپنی شکست کا احساس ہوجانا چاہئے اور اگر ابھی احساس نہیں ہوا تو پھر چھوڑ دیجئے اور آنے دیجئے وہ وقت کہ ایسا احساس پیدا ہوجائے بہرحال اگر احساس پیدا ہوگیا تو پھر مفکرین عالم کو اس طرح سوچنا ہے کہ وہ روحانیت کے دروزاہ سے حل تلاش کریں۔

بدقسمتی سے وقت ایسا ہے کہ جب ہماری آنکھوں کے سامنے روحانیت کا کوئی معصوم یعنی خطاؤں سے بری مجسّمہ موجود نہیں ہے لیکن کم از کم روحانیت کے مٹے ہوئے خط وخال ان تعلیمات کی صورت میں موجود ہیں جو اہل مذاہب کی روحانی جماعت کے ہاتھ میں باوجود اکثر کے فراموش ہوجانے کے پھر بھی محفوظ ہیں۔ اس لئے اتنی امکانی صورت موجود ہے کہ تمام مذاہب عالم کے روحانی مفکرین کی ایک کانفرنس کی جائے اور اس کے لئے ہمارا ملک انڈیا زیادہ موزوں ہے۔ کیونکہ اس کو تجربہ اور اپنی آنکھوں سے مشاہدہ ہو چکا کہ ایک اپنے نقطۂ نظر سے روحانیت کا علمبردار کس طرح مادیت کی تیز وتند ہواؤں میں اپنی باریک آواز کو بلند رکھتا ہے اور کس طرح وہ آواز فتنہ و فساد کی آماجگاہ میں امن کے قیام کی ایک زبردست مبلغ ثابت ہوتی ہے۔ ان مفکرینِ مذاہب کو دعوت دی جائے کہ اپنے اپنے مذہب کے ایسے اصول پیش کریں جو اختلافی حیثیت نہ رکھتے ہوں اور آپس کے مشورے کے بعد ایک ایسا مشترک لائحہ عمل تیار کیا جائے جو عالم میں قیامِ امن کے مفید ہو۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ یہ کوئی نیا مذہب ہوگا جس کو بطور عقیدہ ہر شخص تسلیم ضرور کرے بلکہ تمام مذاہب کے تعلیمات سے اخذ کرکے اسے ایک سیاسی حل کے طور پر اختیار کیا جائے جسے امنِ عالم کے قیام کے لئے بروئے کار لایا جائے۔

ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ ابتداء میں ان افراد کی کوتاہ بینی کی بناء پر کچھ خامیاں لائحہ عمل میں باقی رہ جائیں لیکن یہ اس اصول کی خرابی نہ ہوگی بلکہ ان مفکرین کی نظر کا قصور ہوگا جسے نظر ثانی وثالت کے بعد دور کیا جاسکتا ہے۔

پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک دم سے تمام خرابیاں دور ہوجائیں بلکہ اس راستہ میں قدم اٹھائے جائیں یہ سمجھ کر کہ یہ ایک اسکول ہے جس میں از سرِ نو افرادِ انسانی کو سبق حاصل کرنے کے لئے داخل کیا جارہا ہے جب کہ ہمارا اب تک کا سیاسی اسکول جو مادیت کے پیشِ نظر قدم اٹھا رہا تھا مقصد میں ناکام ثابت ہو چکا۔ بہرحال اس روحانیت کے راستہ میں جو قدم بھی آگے بڑھے گا۔ وہ بے امنی کو کم ہی کرنے والا ہوگا۔ زیادہ کرنے والا قطعاً نہیں ہوسکتا۔

❁❁❁

بقیہ..........دین کو کیسا ہونا چاہئے

حریت اس وقت حاصل ہوسکتی ہے جب اشرف المخلوقات کا نقطۂ امتیاز مرکز حیوانیت میں ضم کرکے محو کردیا جائے، او رہر انسان کو حیوان بنادیا جائے۔

اب مفکران دنیا انصاف کریں کہ وہ الٰہی قانون بہتر ہے جو اقدار انواع واجناس کا تحفظ کرے، یا وہ نظام قابل عمل ہے جو انسان کے اسباب اشرفیت کو مٹا کر حیوان کا ہم سر بنادے۔ معلوم ہوا کہ بس صحیح راستہ اور ہمہ گیر قانون، انسان کو انسان رکھنے والا اصول، صرف اصول دین ہے قوانین مذہب ہیں۔

❁❁❁